آدھی صدی کا سفر

عرفان احمد خان۔ جرمنی

گزشتہ سے پیوستہ، قسط دوم

چند دن مایوسی اور افسردگی کے بادل چھائے رہے لیکن آخر کب تک۔ بہر حال ایک دن باہر نکلنا تھا اور زندگی کی نئی دوڑ میں شامل ہونا تھا۔ جو صلاح مشورے ہوئے اس میں فیصلہ یہی ہوا کہ میں تلاش روزگار کے لئے کراچی چلا جاؤں چنانچہ ماہ فروری کے آخری ایام تھے کہ میں ایک چھوٹے صندوق اور تین تعارفی خطوط جیب میں ڈال کر ربوہ سے جرمنی کی بجائے کراچی کے لئے روانہ ہوا۔ ان تین تعارفی خطوط میں سے ایک تو میرے والد کا مکرم ظفر چودھری صاحب کے نام خط تھا جو ان دنوں قومی ائیر لائن کے چیئرمین تھے۔ دوسرا خط استاذی المحترم ڈاکٹر پروازی صاحب کا مکرم کنور ادریس صاحب کے نام تھا جو ان دنوں کراچی کے ڈپٹی کمشنر تھے اور تیسرا خط استاذی المحترم چودھری محمد علی صاحب کا مکرم حبیب اللہ بٹ کے نام تھا جو بروک بانڈ کمپنی کے غالباً مینجنگ ڈائریکٹر تھے۔ کراچی پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی شہر تھا۔ چھوٹے شہروں اور قصبات میں رہنے والے شہریوں پر اس کا ایک رُعب تھا۔ کراچی سے مرعوب ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چھوٹے شہروں کے جو لوگ کراچی کو سدھارے وہ سالانہ تعطیلات پر گھر آتے تو ان کی بیان کردہ کہانیاں پُرکشش لگتیں۔مثلاً کراچی شہر میں ریلوے کے ایک سے زائد اسٹیشن کی موجودگی مجھے ورطۂ حیرت میں ڈالتی تھی۔ کراچی اُترا تو اس کو واقعی پنجاب کے شہروں سے مختلف پایا۔ میں وہاں ابھی سنبھل نہ پایا تھا کہ ایک صبح اس خبر کی گونج میرے کانوں سے ٹکرائی کہ ظفر چودھری صاحب کو پاک فضائیہ کا سربراہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ مَیں جو کراچی کے راستوں سے ناواقف تھا اس خبر

کے کان میں پڑتے ہی کراچی ایئرپورٹ کی طرف بھاگا۔ پی آئی اے ہیڈکوارٹر کا پتہ کیا۔ وہاں پہنچا تو معلوم پڑا کہ چودھری صاحب مڈوے ہاؤس میں میٹنگ میں مصروف ہیں۔ مڈوے ہاؤس کا پتہ کر کے وہاں پہنچا تو گہرے شیشہ کی شاندار صاف ستھری بلڈنگ جس کے ہر دس قدم پر تازہ پھولوں کے گملے مزین تھے حیرت میں ڈوب گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی دیدہ زیب لابی تھی جس میں دو طرف سے کشادہ سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ وہاں موجود سٹاف کو اپنا مدعا بیان کیا۔ انہوں نے اوپر سے نیچے تک مجھے دیکھا اور کہا کہ یہ خط ہمیں دے دیں۔ مَیں نے اصرار کیا کہ یہ خط میں ظفر چودھری صاحب کے ہاتھ میں دوں گا۔ نوجوان افسر نے مجھے کہا کہ آپ اس آخری Step کے پاس موجود رہیں جب وہ میٹنگ کے بعد نیچے اتریں گے تو آپ نے آگے بڑھ کر ان سے مخاطب ہونا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا چودھری صاحب کے ساتھ قومی ایئرلائن کے افسران کی ایک خاصی تعداد ان کے ہمراہ تھی۔ مَیں نے ذرا بلند آواز میں سلام عرض کیا۔ چودھری صاحب نے میری طرف دیکھا تو مَیں نے یہاں آنے کی غرض بیان کی۔ چودھری صاحب نے والد صاحب کا خط میرے ہاتھ سے لے کر وہاں ہی کھول کر پڑھا۔ اپنے ایک ساتھی سے انگریزی زبان میں مخاطب ہوئے اس خط پر کچھ مختصر لکھ کر اپنے اسی ساتھی کو دے کر مجھ سے کہا کہ مَیں نے پی آئی اے کا چارج ابھی دو منٹ پہلے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا ان کے ساتھ رابطہ میں رہیں۔ وہ افسر مجھ سے مخاطب ہوئے کہ وہ ابھی مجھ سے بات کرتے ہیں۔ آنکھ جھپکنے کے اس منظر کے بعد افسران کا وہ جمِ غفیر ظفر چودھری صاحب کو الوداع کہنے کار کے پورچ تک چلا گیا۔ الوداع کرنے کا وہ قابلِ رشک منظر ابھی تک میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔ چودھری صاحب کو رخصت کر کے متعلقہ افسر میری طرف آئے۔ وہ خط انہوں نے دوبارہ پڑھا اور میرا کراچی میں رابطہ کے لئے ایڈریس پوچھ کر اسی خط پر نوٹ کر لیا۔ دو ہفتے بعد ڈاک میں جواب موصول ہوا کہ جس کا مفہوم یہ

تھا کہ ''قومی ایئرلائن آپ کے بغیر بھی بہت اچھی چل رہی ہے'' یہ تو تھا پہلے سفارشی خط کا حشر۔ باقی دو کے انجام کی روئیداد سے قبل ظفر چودھری سے پہلی اتفاقیہ ملاقات کا احوال قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

مَیں جب نویں یا دسویں جماعت کا طالبِ علم تھا تو میری والدہ معدہ کی کسی تکلیف میں مبتلا ہوگئیں۔ فضل عمر ہسپتال کے علاج کے علاوہ ربوہ میں جو معالجین موجود تھے ان کی بھی مدد حاصل کی گئی۔ جب افاقہ نہ ہوا تو کسی نے سرگودھا میں ایک ماہر ڈاکٹر ابوالحسن کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ والد صاحب روزنامہ سے منسلک تھے صبح کے اوقات میں بہت زیادہ مصروف ہوتے۔ ایک روز اخبار کی کاپی طباعت کے لئے پریس کے حوالے کرنے کے بعد سرگودھا کا سفر اختیار کیا گیا۔ والد صاحب مجھے بھی ساتھ لے گئے کہ بچے کی سیر ہو جائے گی۔ جب ہم ڈاکٹر ابوالحسن کے کلینک پہنچے تو کڑاکے کی دوپہر ہو چکی تھی۔ کلینک کو ہم نے بند پایا اور اب اس نے شام پانچ بجے دوبارہ کھلنا تھا۔ ہم باپ بیٹا کے سامنے یہ سوال کھڑا تھا کہ دوپہر کہاں گزاری جائے۔ ہم بن بلائے مہمان سکواڈرن لیڈر محترم رشید قیصرانی صاحب کے ہاں جا پہنچے۔ انہوں نے ابتدائے جوانی میں ایک سال الفضل میں گزارا تھا۔ اس روز قیصرانی صاحب نے بتایا کہ سرگودھا بیس کے نئے اسٹیشن کمانڈر ایئر کموڈر ظفر چودھری کا تعلق بھی اپنے قبیلہ سے ہے۔ اس پر والد صاحب نے اپنے میزبان کو بتایا کہ ظفر چودھری اپنے دَور طالب علمی میں میرے شاگرد رہے ہیں۔ میں دہلی میں دو سال تک ان کے مکان پر حاضر روزانہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب مجھے ان سے ملے ایک زمانہ گزر چکا۔ قیصرانی صاحب نے والد صاحب سے پوچھ کر چودھری صاحب سے ٹیلیفونک رابطہ کیا۔ چودھری صاحب نے ملنے پر رضامندی ظاہر کی۔ چنانچہ ہم ان کے مکان پر حاضر ہوئے۔ وہ دونوں دہلی کے زمانہ کو یاد کرتے رہے اور میں محوِحیرت سے ان کو تکتا رہا۔ البتہ اس شام پینے والے سکواش کا مزہ آج بھی زبان پر محسوس کرتا ہوں۔ جن دنوں سید قاسم رضوی کمشنر سرگودھا تھے

وہ محترم ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب سے اپنی دوستی کا فائدہ اٹھا کر اپنی ادبی پیاس بجھانے اکثر ربوہ آجایا کرتے تو کئی بار ان کو ظفر چودھری کی رفاقت میسر ہوتی۔ چودھری صاحب سے گفتگو کا موقعہ ان کے حقوق انسانی کی انجمن HRCP کے دفتر میں ملتا رہا۔ البتہ ایک بار کراچی ائیر پورٹ پر جہاز کے انتظار میں لاؤنج میں بیٹھا تھا تو وہاں ظفر چودھری کے والد چودھری بشیر احمد صاحب مرحوم کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے جا ملا۔ انہوں نے میرے دادا کے اس قدر واقعات بیان کئے کہ مجھے لگا یہ فیملی سیالکوٹ سے زیادہ دہلی میں رہائش رکھتی رہی ہے۔

دوسرا تعارفی خط

دوسرا تعارفی خط مکرم کنور ادریس صاحب ڈپٹی کمشنر کراچی کے نام تھا۔ وہ جمعہ کی نماز احمدیہ ہال کی آخری صفوں میں ادا کرتے تھے اور جلد اپنی فوکس ویگن پر بیٹھ کر چلے جاتے۔ ایک جمعہ ان کے پہلو میں نماز ادا کی اور عرض کی کہ ڈاکٹر پروازی صاحب کا خط آپ کی خدمت میں پیش کرنا ہے۔ انہوں نے اتوار گیارہ بجے مکان پر آنے کو کہا، مَیں حسبِ ہدایت ان کی سرکاری رہائش گاہ پر حاضر ہوگیا۔ مجھ سے پہلے دو نوجوان وہاں موجود تھے۔ ان سے فارغ ہو کر کنور ادریس صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ اس دوران میں ان کی غیر متوقع مہمان نوازی چائے کی پیالی سے فارغ ہو چکا تھا۔ خط پڑھ کر جو کھری بات انہوں نے کی وہ میرے اس وقت کے حالات میں مجھے نہ بھی اچھی لگی ہو لیکن عملاً وہ ہی ہوا جس کا انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ ان دنوں مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہو جانے کے بعد نئی نئی سیاسی حکومتیں قائم ہوئی تھیں اور سیاست دان اپنے سیاسی کارکنوں کو نوکریاں دلوانے کے لئے کافی دباؤ میں تھے۔ کنور ادریس صاحب نے کہا روزانہ اخبارات کا مطالعہ کر کے ملازمت کے اعلانات غور سے پڑھوں اور جہاں بھی حصول ملازمت کے لئے درخواست لکھوں وہ

درخواست پہلے کنور ادریس صاحب کے پاس ان کے دفتر لے کر آؤں۔ وہ اس درخواست پر سفارشی ریمارکس لکھ دیں گے۔

میں جب بھی اس کام کے لئے ان کے پاس حاضر ہوا انہوں نے کبھی مجھے انتظار نہیں کروایا۔ فوراً اندر بلا لیتے۔ حصولِ ملازمت کی درخواست پڑھتے اور اسی کے مطابق ریمارکس لکھ کر مجھے واپس کر دیتے۔ نوکری دینا ان کے اختیار میں نہیں تھا لیکن جس بات سے میں بے حد متاثر ہوا وہ ان کا حسنِ سلوک تھا۔ ایک تو وہ کتنے بھی مصروف ہوں مجھے کبھی انتظار نہیں کروایا۔ دوسرے ہمیشہ کامیابی کی دعا دے کر رُخصت کیا جس سے میری ہمت بندھتی اور مَیں نے ایک ایسی نیکی کا عمل سیکھ لیا جو زندگی بھر میرے کام آیا۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک یونہی چلتا رہا کنور ادریس صاحب نے ایک بار بھی اکتاہٹ نہیں دکھائی بلکہ یکایک دو بار متعلقہ کمپنی میں فون بھی کیا۔ ایک بار میرے ہاتھ سے درخواست پکڑتے ہی بے اختیار پکار اُٹھے نیشنل شپنگ کارپوریشن۔ فوراً فون ملایا اور مخاطب شخص سے بہت دوستانہ انداز میں گفتگو کی اور اس کو بتایا کہ میں ایک درخواست پر اپنا نوٹ تحریر کر رہا ہوں اس کو انٹرویو کی کال ضرور آنی چاہیے۔ فون بند کر کے مجھے بھی تسلی دی کہ نیشنل شپنگ میں میرا سول سروس کا ساتھی ہے اب آپ کا کام ہو جائے گا۔ ان کے اندازِ تکلّم میں جو پُراعتمادی تھی اس سے مجھے بھی لگا کہ امتحان کے دن اب ختم ہونے کو ہیں۔ لیکن قدرت مجھے جرمنی لے جانے کا فیصلہ کر چکی تھی

صرف وسیلہ کی راہ ہموار ہونا باقی تھا۔ چند دن بعد دوبارہ کنور ادریس صاحب کے پاس درخواست لے کر حاضر ہوا تو ذرا حیرانگی سے پوچھنے لگے نیشنل شپنگ والوں کی طرف سے انٹرویو کی کال نہیں آئی۔ میرا جواب سُن کر ان کے چہرے پر مایوسی کا تاثر ابھرا۔ میرے کاغذات سامنے رکھ کر سوچوں میں گم ہو گئے پھر ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا، رسیور پکڑا چند سیکنڈ کے توّقف کے بعد واپس رکھ دیا اور مجھ سے یوں مخاطب ہوئے۔ آپ پاسپورٹ بنوالیں، اس میں آپ

کی مدد کر سکتا ہوں پھر باہر قسمت آزمائیں۔ میں نے جواباً عرض کی پاسپورٹ تو بنا ہوا ہے۔ باہر جانے میں حالات اور وسائل رکاوٹ ہیں۔ کنور ادریس صاحب نے کہا باہر جانے کی کوشش جاری رکھیں اللہ آپ کی مدد کرے۔ کنور ادریس صاحب کی دعا کس طرح پوری ہوئی اس کی تفصیل تیسرے خط کی آپ بیتی کے بعد بیان کروں گا۔ اس واقعہ کے کم وبیش چالیس سال بعد مکرم نواب مودود احمد خان صاحب کی شفقت کی بدولت کراچی ڈیفنس کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی تو صف میں میری برابر والی کرسی پر جو ادھیڑ عمر بزرگ جن کی آنکھوں کی بھنویں بھی سفید ہو چکی تھیں تشریف فرما تھے مَیں ان کو دیکھتے ہی پہچان گیا اور ان کے احسانات کو یاد کر کے میری آنکھیں چھلک آئیں۔ یہ میرے محسن محترم کنور ادریس تھے۔

تیسرے خط کی روئیداد

جیسا کہ مَیں نے پہلے عرض کیا میرے پاس تیسرا سفارشی خط بروک بانڈ کے مکرم حبیب اللہ بٹ صاحب کے نام تھا۔ بروک بانڈ کا دفتر شہر سے بہت دُور ماڑی پور کی طرف تھا۔ جہاں جانے کے لئے کئی بسیں بدلنا پڑتیں۔ فون پر رابطہ میں ناکامی کے بعد میں ایک روز ان کے دفتر جا پہنچا۔ استقبالیہ پر موجود خاتون کو پیشگی اطلاع دیئے بغیر میرا یوں چلے آنا اچھا نہ لگا۔ اس روز محترم بٹ صاحب سے ملاقات ہو تو گئی لیکن وہ پہلی اور آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ انہوں محترم چودھری محمد علی صاحب کا خط اور میری درخواست دونوں کو پڑھا اور ایک ہفتہ کے بعد فون کرنے کا ارشاد فرمایا۔ مَیں جب بھی فون کرتا ان کی سیکرٹری اگلے ہفتہ فون کرنے کا کہہ کر فون بند کر دیتی۔ یہ آنکھ مچولی چند ہفتوں تک جاری رہی۔ درمیان میں ایک صاحبِ فراست نے مشورہ دیا کہ مَیں مکرم میجر شمیم صاحب کے نوٹس میں یہ بات ضرور لاؤں۔ مکرم میجر شمیم صاحب کراچی کے نائب امیر تھے اور خود بھی کراچی ڈوپلمنٹ اتھارٹی کے کرتا دھرتا رہ چکے تھے۔

مَیں نے ان کے گوش گزار کر دی۔ انہوں نے مجھے بروک بانڈ میں فون کرنے سے منع کر دیا اور کراچی گیس میں انجنئیر نعیم خان صاحب سے متعارف کروا دیا۔ جس کی قسمت میں تقدیر نے جرمنی جانا لکھا ہوا سے کراچی گیس میں کامیابی ملنا محال تھا۔ البتہ مَیں جب بھی نعیم خان صاحب کے پاس حاضر ہوا انہوں نے روحانی بھائی ہونے کا ثبوت دیا۔ حال احوال پوچھا، حوصلہ بڑھایا اور مشروب پلانے بغیر کبھی واپس نہیں جانے دیا۔

ماضی کی یہ چند ہستیاں جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ان مخلصین کا شمار اپنے وقت کے خدمت گزاروں میں ہوتا ہے۔ ان سے مجھے اسلوب زندگی سیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی نیکیاں اور حسن سلوک آدھی صدی گزرنے کے باوجود بھی میرے دل میں زندہ ہے اور مَیں ان کے بلندیٔ درجات کے لیے دُعاگو ہوں۔

مکرم مسعود احمد جہلمی صاحب سے ملاقات

کراچی میں گزرنے والے ایام کی جو تفصیل بیان کر سکا ہوں یہ اب مجھ پر منحصر تھا کہ مَیں ان کو رونقِ بزم سمجھ کر گزار دیتا یا شکووں کا پنڈورا بکس کھول کر بیٹھ جاتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ربوہ کے ماحول میں پرورش پانے اور ماں باپ کی طرف سے پُر امید رہنے کی نصیحت نے مجھے مایوسی سے بچائے رکھا۔

دعاؤں اور جدوجہد کا یہ عمل جاری تھا کہ ایک جمعہ میں اعلان ہوا کہ جرمنی کے مبلغ مکرم مسعود احمد جہلمی صاحب اتوار کو کراچی پہنچ رہے ہیں۔ اتوار کے روز مَیں بھی ائیر پورٹ جا پہنچا۔ ان کو ربوہ میں دیکھا بیسیوں بار لیکن پہلی ملاقات کراچی ائیر پورٹ پر ہوئی۔ فرمانے لگے ہم آپ کا وہاں انتظار کر رہے تھے۔ ائیر پورٹ پر جو مختصر گفتگو ممکن تھی وہ ہمارے درمیان ہوئی اور انہوں نے ایک دن کے وقفہ کے بعد مغرب کی نماز پر احمدیہ ہال میں ملنے کو کہا۔

جب مَیں ملا تو انہوں نے پوری تفصیل معلوم کی کہ مَیں کیوں اب تک جرمنی نہیں جا سکا۔ یہ سُن کر کہ اب بھی فارغ ہوں ایک طرز کا حکم دیا کہ میں فوراً ربوہ واپس چلا جاؤں۔ مَیں نے والد صاحب سے اجازت کے لیے بات کی تو کہنے لگے اس کا مَیں ذمہ دار ہوں۔ میرے ربوہ پہنچنے سے پہلے آپ کو ربوہ میں ہونا چاہیے۔ بغیر والدین کی اجازت کے کراچی چھوڑنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ اللہ بھلا کرے مکرم طاہر شاہ صاحب (افضل برادرز) جو کالج باسکٹ بال ٹیم میں میرے سینئر تھے اور کراچی میں ٹیلی فون محکمہ کے کسی بڑے افسر کے آفس سیکرٹری تھے ان کو مفت فون کی سہولت حاصل تھی۔ طاہر شاہ صاحب نے ابّاجان سے میرا ٹیلیفونک رابطہ کروا دیا۔ ساری بات سن کر ان کی رائے تھی کہ پہلے جہلمی صاحب ربوہ پہنچ جائیں۔ ابّاجان سے اُن کی ملاقات ہو جائے تو پھر مَیں ابّاجان کے کہنے پر ربوہ آؤں۔ ابّاجان کی رائے جب مَیں نے جہلمی صاحب کے گوش گزار کی تو وہ اپنے پہلے فیصلہ پر قائم رہے اور اوّلین فرصت میں ربوہ جانے پر اصرار کیا اور کہا کہ سال ختم ہونے سے پہلے پہلے جرمنی جانا ہے۔ ابّاجان کو جواب دہ مَیں ہوں۔ تم ربوہ پہنچو۔ اس حکم کے بعد ایک فون مَیں نے ابّاجان کو اَور کیا اور ربوہ روانگی کی اطلاع دی۔

میرے دو دن بعد مکرم جہلمی صاحب بھی ربوہ تشریف لے آئے۔ غلام محمد اختر مرحوم جو اس وقت غالباً ناظر دیوان تھے ان کے مکان دارالصدر میں ہم باپ بیٹا جہلمی صاحب سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ ساری روئیداد سن کر کہ مَیں فرید عارف کے ساتھ کیوں جرمنی نہ جا سکا۔ جہلمی صاحب نے فرمایا آپ کو ون وے ٹکٹ پر ہی بچے کو جرمنی بھجوا دینا چاہیے تھا۔ ساتھ مجھے اطلاع دے دیتے۔ اب بتائیں ون وے کے پیسے ہیں۔ ابّاجان نے عرض کی جو بندوبست کیا تھا وہ سفر اختیار نہ کرنے کی وجہ سے واپس کر دیا۔ جہلمی صاحب نے فرمایا کل سے پھر شروع ہو جائیں۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس کو جرمنی روانہ کرنا ہے۔ چھ ماہ کراچی میں ضائع کر دیئے۔

اس طرح جرمنی جانے کی مہم کا ایک بار پھر آغاز ہوا۔ والدین کے دل میں سَو وَسوسے اُٹھتے کہ ون وے ٹکٹ پر جرمنی میں داخلہ نہ ملا تو میری زندگی قرضہ اُتارتے گزر جائے گی۔ جہلمی صاحب والد صاحب کو تسلیاں دیتے۔ مسعود صاحب دعاؤں کی مدد راستے آسان کر دیتی ہے۔ واقفین کی مدد خدا کے فرشتے کرتے ہیں۔مقصد ابّاجان کو حوصلہ دینا تھا۔ اس سے ملتی جلتی گفتگو ہر دو دن بعد ہوتی۔ٹکٹ کی رقم کا بندوبست ہوتے دسمبر کا وسط آ گیا۔ بچپن سے جلسہ سالانہ سے جو لگاؤ ہے اس کی وجہ سے عین جلسہ سے پہلے روانگی پر دل آمادہ نہ تھا لیکن جہلمی صاحب نے ایک نہ سُنی۔ اور بالآخر 18 دسمبر 1972ء کو مجھے جلسہ سالانہ ربوہ سے آٹھ روز قبل جرمنی کے لئے روانہ کر دیا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے ممالک کے جلسہ سالانہ میں شرکت کا موقع دیا، الحمداللہ علیٰ ذالک

مَیں جن حالات میں ربوہ سے جرمنی کے لئے روانہ ہوا یہ مکرم مسعود احمد جہلمی مرحوم کی دلچسپی اور مہم جوئی کے نتیجہ میں ممکن ہو سکا۔ ہمارے گھر کا ماحول دینی اقدار سے ہٹ کر سوچنے اور دیکھنے کا عادی نہ تھا۔ گھر سے باہر کا معاملہ امتحان بن جاتا اور ابّاجان کے قریبی دوستوں کی مدد سے اس امتحان سے سُرخرو ہوتے۔

میرا اور مجھ جیسے ہزاروں نوجوانوں کا جرمنی یا بیرون ملک آنا نظام اور جماعت کی برکت کا ثمر ہے۔ برکتوں بھرا باغ اب جگہ جگہ لگ چکا ہے جس کی باغباں خلافت ہے اور مکرم مسعود احمد جہلمی صاحب جیسے ہمدرد وجود خلافت کے زیرِسایہ باغبانی پر ہر دَور میں موجود رہتے ہیں۔

مکرم مسعود جہلمی صاحب جو وکیل التبشیر، پرائیوٹ سیکرٹری، امریکہ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ میں مشنری بھی رہے میں خداتعالیٰ نے انسانی ہمدردی اور تعلقات عامہ استوار کرنے کا ہنر بطور خاص عطا کیا تھا۔جس کا اندازہ مجھے جرمنی میں ان کے ساتھ کام کرنے پر ہوا۔ مَیں نے ان سے بہت کچھ سیکھا جو زندگی

پھر مجھے راہنمائی مہیا کرتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے مکرم جہلمی صاحب مرحوم کو پاکستان سے خلافت کی ہجرت کے وقت اہم تاریخی خدمت کی بھی توفیق دی۔ اللہ ان کی خدمت انسان، خدمت اسلام اور ہر نیکی کو قبول کرے اور ان کے درجات بلند کرے، آمین۔

(باقی آئندہ، ان شاءاللہ)